جناب سلیم اختر

اقبال اور نظریۂ پاکستان کی اساس

ہر عصر اپنے مخصوص تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے عظیم شخصیتیں پیدا کرتا ہے۔ ایسی عظیم شخصیات جو اس عہد کے لیے رہنما ستارہ بھی بنتی ہیں اور کوکبِ تقدیر بھی! برصغیر کی گزشتہ صد سالہ تاریخ پر نظر ڈالیں تو قحط الرجال کی عام شکایت کے باوجود چھوٹے بڑے کئی ستارے نظر آجاتے ہیں۔ لیکن تین شخصیتیں ایسی ہیں کہ اگرچہ اپنے عصر کے مخصوص سیاسی، سماجی اور تمدنی عوامل کی پیداوار تھیں مگر ان کا دائرۂ اثر محض اپنے عرصۂ حیات تک محدود نہ رہا بلکہ انھوں نے اپنے زمانہ کو تبدیل کرنے کے ساتھ ساتھ آنے والے زمانے کے لیے جو خواب دیکھے وہ بالآخر مسلم قومیت کی تقدیر ثابت ہوئے۔ یہ تین شخصیات سر سید احمد خان، علامہ اقبال اور قائداعظم ہیں۔

۱۸۵۷ء کے بعد کے حالات نے برصغیر کے مسلمانوں میں دو طرح کے ردِّعمل کو جنم دیا۔ ایک انتہا پر سر سید اور ان کے نامور رفقائے کار تھے جن کا موٹو حالی کے اس مصرع میں سماجاتا ہے "چلو تم ادھر کو ہوا ہو جدھر کی" — دوسری انتہا پر وہ رویہ تھا جس کا سب سے بڑا نمائندہ اکبر الٰہ آبادی اور ان کی شاعری ہے۔ ان دو انتہاؤں کے درمیان موافقت اور مخالفت کے متنوع انداز ملتے ہیں۔ سر سید کی تحریک نزاعی تحریک تھی آج بھی اور صدی پیشتر بھی، لیکن سر سید کی مخالفت میں کہی جانے والی تمام باتوں کے باوجود سر سید کی بصیرت اور پیش بینی کی داد نہ دینا زیادتی ہوگی۔ ۱۸۶۷ء میں ہندی اردو کے جھگڑے سے انھوں نے یہ اندازہ لگایا کہ اگر ہندوؤں کے تعصب کا یہی عالم رہا تو ایک دن ایسا آئے گا جب یہ دونوں قومیں الگ ہونے پر مجبور ہو جائیں گی۔ اس ضمن میں ۱۶ مارچ ۱۸۸۸ء کی تقریر میں یہ معنی خیز جملے قابلِ توجہ ہیں:

سب سے اول جو پولیٹیکل مسئلہ ہے وہ یہ ہے کہ ہندوستان میں ملک کا انتظام اور ملک کی سلطنت کس کی ہونی چاہیے۔ اس وقت فرض کرو کہ تمام انگریزوں کی فوج ہندوستان کو چھوڑ کر چلی جاوے۔ وہ اپنا توپ خانہ اور اپنے تمام عمدہ ہتھیار اور تمام چیزیں جہازوں پر لاد کر لے جاویں تو

ہندوستان میں کون حاکم ہوگا ؟ کیا ایسی حالت میں ہندو اور مسلمان دونوں قومیں ایک گدی پر بیٹھ کر برابر درجے پر رہ سکیں گی ؟ ہرگز نہیں! ضرور ہوگا کہ دونوں میں سے ایک دوسرے کو مغلوب کرے اور دبا لے۔ یہ چاہیئے کہ دونوں برابر رہیں یہ ناممکن اور امر محال ہے۔ اس کے ساتھ یہ بھی سمجھ لینا چاہیئے کہ گو مسلمان ہندوستان میں بہ نسبت ہندوؤں کی تعداد کے کم ہوں اور گو ان کی تعداد بھی بہت زیادہ ہو جو انگریزوں میں اعلیٰ درجے کی تعلیم پاتے ہوتے ہیں لیکن ان کو حقیر اور کمزور سمجھنا نہیں چاہیے۔ غالباً وہ خود ہی اپنے سنبھالنے کے لیے کافی ہوں لیکن اگر نہ ہوں تو جس وقت ایک ٹڈی دل مسلمان پٹھان بھائیوں کا پہاڑوں کی کھوؤں سے نکلے گا وہ اس سرے سے بنگالے کے اس سرے تک خون کی ندیاں بہا دے گا۔ یہ بات کہ انگریزوں کے چلے جانے کے بعد کون غالب ہوگا، خدا کی مرضی پر موقوف ہے لیکن جب تک کہ ایک قوم دوسری قوم کو زیر نہ کرے گی اور تابعدار نہ بنا لے گی ملک میں امن نہ ہوگا۔ یہ امر ایسا مسلّم الثبوت ہے کہ اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔

کیا ۱۸۸۸ء میں کوئی اور مسلم راہنما ایسے خیالات کا اظہار کرنے کی صلاحیت یا جرأت رکھتا تھا ؟

جداگانہ قومیت کے جس احساس کو سرسید نے محسوس کیا اور جس کے مضمرات کے بارے میں غالباً خود سرسید کو بھی صحیح قسم کا اندازہ نہ ہوگا۔ وہی احساس علامہ اقبال کے سیاسی تدبر کی اساس بنتا ہے جسے قائداعظم کی قیادت نے حقیقت کا روپ دیا۔ جہاں تک علامہ اقبال کی سیاسی بصیرت اور فکر میں سیاسی رجحانات کا تعلق ہے غالباً ان کے لیے تصور پاکستان پر پہنچنا اتنا دشوار نہ ہوگا اس لیے کہ ایک تو ابتدا سے ہی خود کو مسلمانوں کے لیے وقف کر رکھا تھا اس پر مستزاد یہ خواب :

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے
نیل کے ساحل سے لے کر تا بخاک کاشغر

اگر علامہ مسلم ممالک کے سیاسی اتحاد پر مبنی ایک وحدت کا تصور کر سکتے تھے تو کیا برصغیر کے مسلمانوں کی وحدت کا نہ سوچ سکتے تھے ؟ یوں دیکھیں تو پاکستان کا خواب ایک بڑے خواب میں شامل ایک چھوٹا خواب بن جاتا ہے۔ اسے یوں ہی سمجھا جا سکتا ہے کہ مسلم ممالک کی وحدت کے حصول کے ذرائع میں سے پاکستان بھی ایک ذریعہ بن جاتا ہے۔ آج کی بین الاقوامی سیاست میں پاکستان سمیت مسلم ممالک کی یہ وحدت کتنا مؤثر کردار ادا کر سکتی ہے ؟ اسے نظریاتی طور پر ثابت کرنے کی

ضرورت نہیں۔ صرف نقشے پر ایک نگاہ ڈال لینی کافی ہے۔ اس نقطۂ نظر سے پاکستان کی تاریخ کا مطالعہ کرنے پر یہ باور کیا جا سکتا ہے کہ پاکستان نے اسلامی اتحاد کے لیے مقدور بھر کوشش کی۔ لہٰذا اور نہیں تو کم از کم اس لحاظ سے خواب کی تعبیر اچھی نکلی۔

قائداعظم اور علامہ اقبال میں جو روابط تھے انھیں بطورِ خاص اجاگر کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس موضوع پر بہت کچھ لکھا گیا ہے کہ اب یہ ہماری قومی جدوجہد کی تاریخ کا ایک جداگانہ مگر اہم ترین باب ہے۔ علامہ اقبال نے قائداعظم کو جو درجہ دے رکھا تھا اسے اس سے سمجھا جا سکتا ہے کہ قومی سیاست میں اقبال کے لیے قائداعظم بھی ایک طرح سے مولانا رومی تھے۔ ۲۱ جون ۱۹۳۷ء کو اپنے ایک مکتوب میں قائداعظم کو یوں لکھا:

"میں جانتا ہوں کہ آپ بے حد مصروف انسان ہیں لیکن مجھے توقع ہے کہ آپ میرے بار بار لکھنے کا برا نہ مانیں گے۔ کیونکہ آج صرف آپ ہی ایسی ہستی ہیں جس کی طرف شمال مغربی ہند میں آنے والے طوفان بلکہ تمام ہندوستان میں آنے والے طوفان میں محفوظ راہنمائی کے لیے ہمارا طبقہ آپ کی طرف دیکھنے کا حق رکھتا ہے۔"[۱]

قائداعظم بھی علامہ اقبال کی تخلیقی صلاحیتوں، قومی درد اور سیاسی تدبر کے قائل تھے۔ چنانچہ ۱۹۴۴ء میں لاہور میں یوم اقبال کے موقع پر قائداعظم نے علامہ اقبال کو ان الفاظ میں خراج عقیدت پیش کیا:

"علامہ اقبال صرف اخلاقی درس دینے والے فلسفی ہی نہ تھے بلکہ وہ حوصلہ مندی، عمل، استقامت اور خود اعتمادی کے علم بردار تھے۔ اس پر مستزاد یہ کہ وہ اللہ پر پختہ ایمان رکھتے تھے۔ انھوں نے اسلام کے لیے اپنی زندگی وقف کرنے کا پیغام دیا تھا۔ ان کی شخصیت میں ایک شاعر کی نصب العین پسندی اور ایک عملی انسان کی حقیقت بینی کا امتزاج تھا۔ الغرض ایمان، مسلسل محنت اور عملِ پیہم میں ان کے پیغام کی روح نہاں ہے۔ انھی صفات میں وہ سچے مسلمان تھے، اسلام کے اصولوں پر ان کا پختہ یقین تھا۔ ان کے بموجب ایک کامیاب زندگی کا مقصد یہ تھا کہ انسان کی

---

[۱] اقبال کے خطوط جناح کے نام (انگریزی ایڈیشن)، ص ۱۹

خودی مائل بہ عمل ہوا اور اسی مقصد کے حصول کے لیے وہ اسلامی تعلیمات کی پیروی کو لازم جانتے تھے۔ انھوں نے انسانیت کو عملِ پیہم، خود شناسی اور خود نگری کا درس دیا۔ وہ عظیم شاعر اور عظیم فلسفی تھے۔ یقین محکم اور اسلامی تصوّرات کی حقانیت پر پختہ یقین کے ساتھ ساتھ وہ ان چند ہستیوں میں سے ایک تھے جنھوں نے اپنے منفرد فکر کی بنا پر یہ نتیجہ اخذ کیا کہ برصغیر کو مسلمانوں کے ملّی وطن کے طور پر شمال مغربی اور شمال مشرقی خطوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔"

علامہ اقبال اور قائداعظم کے درمیان خط و کتابت کی اہمیت واضح کرنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ لیکن ہوا یہ کہ قائداعظم کے پاس تو علاّمہ کے خطوط محفوظ رہے لیکن علاّمہ کے انتقال کے بعد جب قائداعظم نے اپنے خطوط کے بارے میں ان کے ٹرسٹیوں سے استفسار کیا تو معلوم ہوا کہ وہ خطوط گم ہو چکے ہیں۔ چنانچہ صرف علامہ کے خطوط ہی ۱۹۴۲ء میں طبع کیے گئے۔ قائداعظم نے خطوط کے اس مجموعہ کا پیش لفظ لکھتے ہوئے علاّمہ اقبال کی سیاسی بصیرت اور پنجاب میں مسلم لیگ کی تنظیم کے ضمن میں علامہ کی خدمات کو سراہتے ہوئے بے لوث خدمت کرنے والے پُرخلوص احباب میں ان کا شمار کیا تھا۔ علامہ کے ان ۱۴ خطوں کی اہمیت پر بھی قائداعظم نے بطورِ خاص زور دیا تھا۔ اس لیے کہ مئی ۱۹۳۶ء سے لے کر نومبر ۱۹۳۷ء کے درمیان لکھے گئے یہ خطوط برصغیر کی سیاسی تاریخ کے اہم ترین موڑ سے متعلق ہیں جو قائداعظم کے اپنے الفاظ میں "واقعات سے پُرعہد" تھا۔ یہی وہ دور تھا جس میں ۱۹۳۵ء کے انڈیا ایکٹ کی رُو سے صوبائی حکومتوں کے انتخابات عمل میں لائے گئے اور بقول قائداعظم:

"مسلم لیگ نے یہ زرّین کارنامہ کر دکھایا کہ اکثریت اور اقلیت دونوں طرح کے صوبوں میں لیگ کی برتری تسلیم کرلی گئی۔ اس ضمن میں سر محمد اقبال نے بے حد نمایاں کردار ادا کیا۔ ہرچند کہ عوام کی اکثریت اس سے آگاہ نہیں ہے۔"

قائداعظم کے نام لکھے گئے ان مختصر و طویل مکاتیب میں اقبال نے اس عہد کی سیاست سے وابستہ کئی امور چھیڑے ہیں۔ ان خطوط کا مجموعی تاثر یہ ہے کہ گو علامہ اقبال قائداعظم کا بے حد احترام کرتے تھے لیکن اپنی رائے کے اظہار میں بے باک تھے۔ چنانچہ جن امور کے بارے میں ان کے ذہن میں الجھنیں تھیں وہ بلا تکلّف ان کے بارے میں اپنے شکوک کا اظہار کرتے ہیں۔ اس سلسلہ میں

سکندر جناح پیکٹ کا بطور خاص نام لیا جا سکتا ہے۔

قومی نقطۂ نظر سے ان خطوط کی اہمیت اس امر میں مضمر ہے کہ یہ خطوط نظریۂ پاکستان پیش کرنے کے بعد لکھے گئے تھے اس لیے آج تاریخی اہمیت سے قطع نظر یہ خطوط اس بنا پر بے حد اہم ہیں کہ مفکرِ پاکستان کا ان امور کے بارے میں کیا طرزِ فکر تھا جو بالواسطہ یا بلاواسطہ طور پر اس مملکت کو درپیش ہو سکتے تھے۔ گزشتہ تیس برس سے ہمارے ہاں پاکستان کا مطلب کیا؟ قسم کی بڑی ناخوش گوار بحث جاری ہے۔ یہ بحث اس لیے زیادہ بے معنی ہو جاتی ہے کہ اصل اور بنیادی ماخذات سے استفادہ کے برعکس بدلے ہوئے سیاسی حالات میں حکومتِ وقت کے رجحانات سے مطابقت رکھنے والی توجیہات اور تاویلات پیش کی جاتی ہیں۔ بجائے اس کے کہ نظریۂ پاکستان کی روشنی میں پاکستان کے سیاسی، تہذیبی اور مذہبی امور کا جائزہ لے کر ان کے حسن و قبح کی چھان پھٹک کی جاتی۔ ہوا یہ کہ وقتی مصلحتوں کی خاطر پاکستان کی تصوراتی اساس میں حسبِ ضرورت، حسبِ منشا رنگ بھرنے کی سعی کی گئی جس کا نتیجہ قومی سطح پر ذہنی انتشار کی صورت میں رونما ہوا۔ اس ضمن میں اسلام کے لفظ کا جس طرح سے استحصال کیا گیا وہ ایک الگ داستان ہے۔ اسلام کا نعرہ تو ہر عہد میں مقبول ترین نعرہ رہا۔ البتہ مختلف حالات میں اس کے معانی بدلتے رہے بلکہ بدلے جاتے رہے ہیں۔ اس تناظر میں رکھ کر اگر علامہ اقبال کے خطوط کا مطالعہ کریں، تو یہ ہماری بڑی اچھی طرح سے راہنمائی کر سکتے ہیں۔ بلکہ میں تو انھیں خطوط سے بڑھ کر تاریخی دستاویزات کا درجہ دینے کو تیار ہوں کہ یہ ہمارے وطن کی نظریاتی سرحدوں کی نشاندہی کرتے ہیں۔

۲۰۔ مارچ ۱۹۳۷ء کو مسلمانوں کی سیاسی تنظیم اور اسلام کو ترازو کے دو پلڑوں میں رکھتے ہوئے اقبال یوں رقم طراز ہوئے:

"مجھے یقین ہے کہ آپ اس امر سے بخوبی آگاہ ہوں گے کہ نئے آئین نے بالآخر ہندوستانی مسلمانوں کو اپنی تنظیم کے لیے منفرد موقع فراہم کیا ہے۔ یہ ہندوستان اور ایشیا کے مسلمانوں کے سیاسی مستقبل کے لیے بے حد اہم ہے۔ اگرچہ ہم ملک کی دیگر ترقی پسند جماعتوں سے تعاون کے لیے تیار ہیں مگر ہمیں یہ حقیقت کبھی نہ فراموش کرنی چاہیے کہ ایشیا میں اخلاقی اور سیاسی قوت کے طور پر اسلام کے مستقبل کا انحصار ہندوستانی مسلمانوں کی کلی تنظیم پر ہے۔"

اس مکتوب کی آخری سطروں سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ علامہ اقبال ہندوستان اور ایشیا میں اسلام اور ان کے حوالے سے مسلمانوں کو ایک دوسرے سے پیوست تصور کرتے تھے۔ یہ تصورِ اسلام مُلا کے اسلام سے مختلف بلکہ برعکس ہے۔ کیونکہ علامہ نے اسلام کو کبھی بھی محض رکوع و سجود کے مترادف نہ جانا۔ یہی نہیں جب پاکستان کا مطلب کیا۔ لا الہ الا اللہ کا نعرہ بلند ہوا تو ایک لحاظ سے وہ علامہ کے ان ہی افکار کا عطر تھا۔ اس نعرے کے لیے جدوجہد کرنے والوں کے دل و دماغ میں بھی علامہ کے ایسے ہی افکار کی بازگشت ہوگی۔ اس نعرہ نے بالآخر مسلمانوں کو متحد اور منظم کر کے ملتِ بیضا کی تشکیل کی۔ اس خط میں علامہ اقبال نے یہ بھی لکھا:

"ہندوستان کے اندر اور باہر کی دنیا پر اس امر کی وضاحت از حد ضروری ہے کہ اس ملک میں محض معاشی مسئلہ نہیں ہے۔ مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے تہذیبی مسئلہ ہندوستان کے بیشتر مسلمانوں کے لیے زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔ کم از کم اسے معاشی مسائل سے بلحاظ اہمیت کسی طرح سے بھی کمتر نہیں قرار دیا جا سکتا۔ میں ہندوؤں پر یہ حقیقت واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ ان کی سیاسی چالیں خواہ وہ کتنی لطیف ہی کیوں نہ ہوں ہند کے مسلمانوں کو اپنے تہذیبی تشخص سے باز نہیں رکھ سکتیں"[۵۳]

اس کے ساتھ اگر ۲۸ مئی ۱۹۳۷ء کے خط کی یہ سطریں ملا کر پڑھیں تو یہ واضح ہو جاتا ہے کہ علامہ اقبال کیسا پاکستان چاہتے تھے:

"اسلامی قوانین کے طویل اور محتاط مطالعہ کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اگر ان قوانین کو صحیح طور سے سمجھ کر بروئے کار لایا جائے تو کم از کم ہر شخص کی بنیادی احتیاجات پوری کرنے کی ضمانت دی جا سکتی ہے۔ لیکن اسلامی شریعت کا نفاذ اور ان کی نشوونما ایک مسلم مملکت یا مملکتوں کے قیام کے بغیر ناممکن ہے۔ کئی برسوں سے میرا یہ ایمان دارانہ عقیدہ رہا ہے اور اب بھی میں اُسے درست جانتا ہوں کہ مسلمانوں کے لیے روٹی اور ہندوستان کے لیے امن و امان اسی طرح سے حاصل کیا جا سکتا ہے"[۵۴]

---

۵۳ اقبال کے خطوط جناح کے نام (انگریزی)، ص ۱۲

۵۴ ایضاً، ص ۱۶

علامہ اقبال اسلام کو ایک لائحۂ عمل اور ضابطۂ حیات سمجھتے تھے۔ اس لیے معاشی مسائل کا حل بھی مذہب میں تلاش کرنے کی سعی کرتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ وہ مذہب کے ساتھ سیاست سے بھی یہی توقع رکھتے ہیں کہ وہ معاشی مسائل کا حل پیش کرنے کا باعث بن سکے۔ چنانچہ ۲۱ جون ۱۹۳۷ء کے مکتوب میں مسلمانوں کے سیاسی حقوق تسلیم کیے جانے پر ان خیالات کا اظہار کیا:

"لیکن ان لوگوں کے ایسے حقوق تسلیم کرنے کا کیا فائدہ جن کی غربت کے مسائل حل کرنے میں یہ آئین کسی طرح سے بھی ممد و معاون ثابت نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا یہ بے سود ہے۔"۵۵

علامہ اقبال نے یہ خطوط اس ہستی کو لکھے ہیں جس کے بارے میں ان کا یہ عقیدہ تھا کہ یہ مسلمانوں کا بہترین راہنما ہونے کے ساتھ ساتھ پاکستان حاصل کرنے کی صلاحیتیں بھی رکھتا ہے۔ اس لیے ان خطوط کا ایک ایک لفظ قابلِ غور ہے۔ علامہ اقبال پاکستان کی نظریاتی اساس اسلام پر استوار دیکھتے تھے اس لیے انھوں نے مختلف مواقع پر اسلام کی تعریفِ نو کرنے کی سعی کرتے ہوئے اس کے سیاسی مضمرات اجاگر کرنے کی سعی کی۔ چنانچہ ۲۸ مئی ۱۹۳۷ء کو لکھتے ہیں:

"میرے ذہن میں یہ امر بالکل واضح ہے کہ سماجی جمہوریت کو تسلیم کر لینے سے ہندو مت، ہندو مت نہ رہے گا جبکہ کسی موزوں صورت اور اسلامی قوانین کی مطابقت میں سماجی جمہوریت کو تسلیم کر لینا اسلام کے لیے اتنا انقلابی ثابت نہ ہوگا بلکہ یہ تو اسلام کی حقیقی طہارت کی طرف مراجعت کے مترادف ہوگا۔ اس لیے ہندوؤں کے مقابلہ میں مسلمانوں کے لیے جدید مسائل کا حل تلاش کرنا کہیں زیادہ آسان ہے۔"۵۶

یہ حقیقت ہے کہ جب تک قائداعظم نے مسلم لیگ کی عنان نہ سنبھالی تھی اس وقت تک مسلم لیگ کو سیاسی حلقوں میں کوئی خاص اہمیت نہ دی جاتی تھی۔ اسے بالعموم نوابوں اور جاگیرداروں کا ٹولہ سمجھا جاتا تھا۔ عوام کے لیے اس کے پاس کوئی منصوبہ نہ تھا اس لیے مسلم عوام کی اکثریت اس سے لاتعلق تھی۔ قائداعظم نے آکر پہلی مرتبہ اس کا عوامی مزاج متعین کیا اور دن رات کی محنت سے اسے ہندوستانی مسلمانوں کی واحد

---

۵۵ اقبال کے خطوط جناح کے نام (انگریزی)، ص ۲۰-۲۱

۵۶ ایضاً، ص ۱۷

جماعتی تنظیم بن گئی لیکن اقبال کے نقطۂ نظر سے ابھی تک مسلم لیگ صحیح معنوں میں عوامی جماعت نہ بنی تھی۔ اور جن الفاظ میں علامہ نے قائداعظم کی توجہ اس امر کی طرف مبذول کرائی وہ سیاست کے اس بنیادی نکتے پر مبنی ہے کہ عوام کے بغیر سیاسی جماعتیں اور سیاسی تصورات محض بے آب ہو جاتے ہیں۔ پاکستان مسلم لیگ نے بنایا تھا لیکن پاکستان کو ایک تصوراتی مملکت بنانے میں کیوں ناکام رہی؟ علامہ اقبال نے اس ضمن میں جن خیالات کا اظہار کیا تھا مسلم لیگ کے لیڈر غالباً ان سے ناواقف تھے اس لیے جب ان کا عوام سے رابطہ منقطع ہو گیا تو عوام نے بھی انھیں مسترد کر دیا۔ ۲۸ مئی ۱۹۳۷ء کے مکتوب میں علامہ نے قائداعظم کو لکھا:

"بالآخر مسلم لیگ کو اس امر کا فیصلہ کرنا ہوگا کہ اسے ہندوستان کے مسلمانوں کے بالائی طبقہ کے مفادات کی نمائندگی کرنی ہے یا مسلمانوں کی اکثریت کی، جنھوں نے بہتر وجوہات کی بنا پر اب تک اس میں کسی طرح کی دلچسپی کا اظہار نہیں کیا۔ ذاتی طور پر میں تو یہ عقیدہ رکھتا ہوں کہ وہ سیاسی جماعت جو مسلم عوام کی بہبود کے لیے کوئی منصوبہ نہیں رکھتی وہ عوام کی کثیر تعداد کے لیے باعثِ کشش ثابت نہیں ہو سکتی۔ نئے آئین کے بموجب اعلیٰ عہدے بالائی طبقہ کے بیٹوں کو دیے جاتے ہیں۔ نسبتاً کم تر عہدے وزیروں کے دوستوں اور رشتہ داروں کے لیے مخصوص ہو جاتے ہیں۔ دیگر معاملات میں بھی ہمارے سیاسی اداروں نے بحیثیت مجموعی مسلمانوں کی بہبود کے لیے کبھی نہیں سوچا۔ چنانچہ روٹی کا مسئلہ شدید سے شدید تر ہوتا جا رہا ہے۔ مسلمان اب یہ محسوس کر رہا ہے کہ گزشتہ دو صدیوں سے وہ پست سے پست تر ہوتا جا رہا ہے۔ عام حالات میں تو خیر وہ یہی سمجھتا ہے کہ اس کی غربت کا باعث ہندو سود خور یا سرمایہ دارانہ نظام ہے۔ لیکن ابھی اس پر یہ ادراک طلوع نہیں ہوا کہ یہ سب کچھ تو غیر ملکی حکومت کی بنا پر ہے لیکن بالآخر اس پر یہ حقیقت منکشف ہوتی ہے۔ جواہر لعل نہرو کا ملحدانہ سوشلزم[۱] مسلمانوں کے لیے باعثِ کشش

---

[۱] علامہ اقبال نے ان خطوط میں کئی جگہ جواہر لعل نہرو کے سیاسی مسلک کو ملحدانہ سوشلزم کہا۔ ایک جگہ یوں لکھا:

"مسلم ہند کے مسائل سے عہدہ برآئی کے لیے قطعی اکثریت کی بنیاد پر ملک کی ایک یا ایک سے زائد مملکتوں

ثابت ہوگا اس لیے مسئلہ یہ ہے کہ مسلمانوں کی غربت کیسے دور ہو؟ لہٰذا مسلم لیگ کے تمام مستقبل کا انحصار اس کارکردگی پر ہے جو اس مسئلے کے حل کے لیے ہوگی۔ اگر مسلم لیگ اس قسم کا کوئی وعدہ نہیں کر سکتی تو مجھے یقین ہے کہ پہلے کی مانند اب بھی مسلمانوں کی اکثریت اس سے غیر متعلق رہے گی ۵۴

حکیم الامت کے یہ الفاظ الہام ایسی صداقت کے حامل ثابت ہوتے کہ مسلم لیگ نے پاکستان بنایا لیکن اس کی قبر بھی اسی پاکستان میں بنی۔

میں تقسیم تو لازمی ہے۔ کیا آپ یہ نہیں سمجھتے کہ ایسے مطالبے کے لیے موزوں وقت آگیا ہے؟ غالباً جواہر لعل نہرو کے ملحدانہ سوشلزم کا آپ سب سے بہتر یہی جواب دے سکتے ہیں۔"

۵۵ اقبال کے خطوط جناح کے نام (انگریزی)، ص ۱۵-۱۶

کیا مذہب کوئی نجی اور شخصی معاملہ ہے؟ کیا آپ پسند کریں گے کہ اسلام کا بھی حشر بحیثیت اخلاقی و سیاسی تصور کے عالم اسلام میں وہی ہو جو یورپ میں مسیحیت کا ہوا؟ کیا یہ ممکن ہے کہ اسلام کو اخلاقی تصور کے طور پر تو باقی رکھا جائے مگر بحیثیت نظامِ حکومت کے اُسے قومی سیاست کے حق میں مسترد کر دیا جائے جس میں مذہبی طرزِ فکر حصہ لینے کی اجازت نہ ہو؟

اسلام بنیادی طور پر ایک مذہبی تنظیم ہے جس کے حدود قطعی واضح ہیں، خدا کے ایک ہونے پر ایمان، تمام انبیاء مرسلین پر ایمان، محمد رسول اللہؐ کے خاتم النبیین ہونے پر ایمان —— مؤخر الذکر عقیدہ وہ حقیقت ہے جس کے ذریعے مسلم اور غیر مسلم کے درمیان ٹھیک ٹھیک حد قائم ہو جاتی ہے اور کسی فرد یا گروہ کے متعلق یہ فیصلہ کرنے کے قابل ہو جاتا ہے کہ وہ شخص یا گروہ اس تنظیم میں شامل ہے یا نہیں۔

سیاست کی جڑ آدمی کی زندگی میں گڑی ہوتی ہے۔ یہ میرا عقیدہ ہے کہ اسلام شخصی اور نجی رائے کی چیز نہیں ہے۔ اسلام ایک سوسائٹی ہے۔ آپ چاہیں تو اُسے سیویک چرچ بھی کہہ سکتے ہیں۔

اقبال